مابعد جدید تناظر اور ڈاکٹر قاضی عابد کی تنقید نگاری

Perspective of Postmodern and Criticism of Dr. Qazi Abid

محمد یوسف نون
لیکچرر اردو، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور
ڈاکٹر طارق محمود
پروفیسر شعبہ اردو۔ پرنسپل، جی۔ سی۔ میاں چنوں

Abstract:

Dr. Qazi Abid is a well renowned Urdu critic. He was a pragmatic progressive and neo-Marxist. Like many other progressives he was not intellectually stagnant. His progressivism draws light from modernism and postmodernism rather than to oppose them. To him, to be progressive is to be enlightened and big-hearted. Instead of establishing novel theoretical discourse, he has practically applied all the new discourses to Urdu literature. For intellectual satisfaction, he had direct access to Western philosophies; and resultantly, his criticism doesn't have any ambiguity and contradiction. He finds many similarities between modernism and postmodernism. Dr. Qazi has successfully applied discourses such as structuralism, post structuralism, post colonialism and neo colonialism, historiography and neo historiography to the texts of Urdu literature.

کلیدی الفاظ: تنقید، عملی تنقید، اطلاقی تنقید، نظریاتی تنقید، مابعد جدیدیت، مغربی فکر و فلسفہ

عمومی طور پر تنقید کے علم کو اس کے دائرہ کار کی بنیاد پر بانٹا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظری اور عملی تنقید کے دو بڑے شعبے ہیں۔ نظری تنقید فلسفیانہ اور فکری تصورات کا حامل شعبہ ہے، جو نئے واردانِ بساط نقد و نظر کو کسی فن پارے کو پڑھنے اور تفہیم و تعبیر کے انداز اور راہ سمجھاتا ہے۔ عملی یا اطلاقی تنقید ان تنقیدی تصورات، فکریات و فلسفہ کی روشنی میں کسی بھی فن پارے کو پڑھتی سمجھتی اور تعبیر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ قیمت و قدر متعین کرتی ہے۔ حالی کی ابتدائی امتزاجی تنقید سے لے کر آج کی جدید سے مابعد جدید تنقید تک ہمیں کئی نظری و فکری ناقدین نے اپنی فکر سے متاثر کیا یا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اردو میں نظری تنقید کے سر چشمے زیادہ تر مغربی دانش یا عربی و فارسی سے پھوٹتے ہیں۔ بدیسی تصورات و نظریات کے بیشتر پرچارک ان نظری تصورات کا عملی اطلاق کرنے سے قاصر رہے ہیں ناقدین کی طرف سے جو فکریات نظری تنقید کے باب

میں شد و مد سے پیش کی جاتی ہیں اور دوسرے ناقدین کو ان پر عمل پیرا ہونے کی سختی سے تلقین کی جاتی ہے، عملی طور پر ان کی اپنی لکھی تنقیدیں تہی دامنی کا شکار نظر آتی ہیں۔ ایسی تنقیدیں نہ صرف پھیکی اور پھسپھسی ہیں بلکہ اپنے ناقد کے فکری و عملی تضادات پر دال بھی ہیں۔

اردو تنقید کو ثروت مند بنانے میں ایسے ناقدین کا خاص حصہ شامل ہے، جنہوں نے بر آمدی فکریات و تصورات جبری طور پر کسی فن پارے پر تھوپنے کی بجائے اس کی قدر و قیمت متعین کرنے اور تفہیم و تعبیر کے لیے سانچے اور پیمانے اس فن پارے کے اندر سے کشید کیے ہیں۔ ایسے ناقدین میں اہم اور ایک بڑا نام ڈاکٹر قاضی عابد(۱) کا بھی ہے، انہوں نے تنقید کے نظری مباحث میں الجھنے اور لٹکنے کی بجائے مغربی نظریات سے بلاواسطہ استفادہ کرتے ہوئے اردو متون پر اپنی امتزاجی فکر کی آمیختی کے بعد عملی اطلاق کیا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ اس قبیل کے ناقدین کے ہاں مقدار سے بڑھ کر معیار کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد فکری طور پر مارکسی اور ترقی پسند تھے۔ اردو کے کئی دیگر مارکسی نقادوں کی مانند کبھی بھی کسی طرح کے جمود کا شکار ہر گز نظر نہیں آتے، ان کی فکر مسلسل ارتقاء پذیر رہی ہے۔ وسیع مطالعہ نے ان کی فکر کو وسعت بخشی، یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی خاص سکہ بند فکر کے پیرو بننے کی بجائے مختلف فکریات سے برابر استفادہ کرتے ہیں۔ وہ مارکس کے حامی اور ترقی پسند تھے۔ ان کی ترقی پسندی روایتی ہر گز نہیں تھی۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر محمد عقیل، فصیل جعفری، احمد، احمد ہمیش اور دیگر ان کی مانند ہر نئی فکر کی مخالفت کی ٹھاننے کی بجائے اس سے روشنی لے کر اپنی فکر کو مزید ثروت مند بناتے نظر آتے ہیں۔ روایتی ترقی پسندی کے تنگ دائرے سے نکل کر ادب اور زندگی کو زیادہ کشادہ نظر سے دیکھنے اور اسے زندگی کی ایک سے زیادہ حقیقتوں کو کھولنے اور پرکھنے کا ہنر باخوبی جانتے تھے۔ رقم طراز ہیں:۔

> "ادب اور زندگی کو روایتی ترقی پسندوں کی طرح نہیں دیکھتا، جدیدیت اور مابعد جدیدیت میرے لیے شجر ممنوعہ نہیں بلکہ ترقی پسند فکر اور سوچ کے نئے پیمانے ہیں۔ دراصل ہمارے ہاں شمس الرحمن فاروقی اور ڈاکٹر وزیر آغا نے جدیدیت کی من مانی تعبیر اور اسے مغربی جدیدیت سے ہم رشتہ نہیں ہونے دیا۔۔۔ اسی طرح مابعد جدیدیت اور ترقی پسند فکر کے درمیان جو ایک اٹوٹ رشتہ ہے اسے بھی اردو کے مابعد ناقدین نے اپنی من گھڑت تعبیرات سے پیچیدہ بنا دیا ہے۔"(۲)

جو ادیب اور نظریات ترقی پسند فکریات سے میل نہ کھاتے یا تھوڑا بہت مخالف جاتے تھے تو ترقی پسندوں نے انہیں شجر ممنوعہ قرار دے رکھا تھا۔ ان کا مطالعہ اور ان پر بات کرنے تک کی اجازت نہ تھی۔ منٹو اور انتظار حسین جیسے بڑے تخلیق کاروں کو ان کا جائز مقام نہ ملا اور مجالس و تقاریب میں ان پر بات بھی نہ کی

جاسکتی تھی۔ ایسا وقت بھی گزرا کہ منٹو سے ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ جدیدیت پسند بھی منحرف ہو گئے۔ دانش گاہوں کے نصاب میں منٹو کو کوئی جگہ دینے کو تیار نہ تھا۔ ایسے میں ڈاکٹر قاضی عابد ان معدودے چند میں سے تھے جنہوں نے منٹو کو نہ صرف نصاب کا حصہ بنایا بلکہ منٹو پر لکھا اور ترقی پسندوں کے حلقوں میں مکالمے کا آغاز بھی کیا۔ ان کے نزدیک ترقی پسند ہونا زندگی سے بھرپور ہونا اور کشادہ ذہن اور کشادہ دل ہونا ہے۔ ان کی ترقی پسندی فکری ترقی کا دوسرا نام تھا، جو نئی فکریات کو سموتی اور سمیٹتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف خود کارل مارکس، لینن، لیوتارڈ، دریدا، ٹیری ایگلٹن، فینن، ایڈورڈ سعید، اومی کے بھابھا، اقبال احمد اور کئی دیگر نظریہ ساز فلاسفہ کا بلاواسطہ مطالعہ کیا بلکہ اپنے شاگردوں کو بھی اس طرف راغب کیا اور ان سے تراجم بھی کرائے۔ وسیع مطالعے نے انہیں ذرخیز فکر سے مالا مال کیا تھا۔ وہ ایسے نکات اٹھاتے اور ان پر سوالات قائم کرتے ہیں کہ اپنی فکر رسا کے ساتھ قاری کو ٹھہر کر سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں:۔

> "(الف) مارکس نے کہا تھا کہ خیال مادے سے جنم لیتا ہے۔ فوکو نے کہا کہ ہر خیال سماجی تشکیل ہے۔ ان دونوں باتوں کے بیچ کیا رشتہ ہے؟ ہمیں اس تشابہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔
> (ب) دریدا نے متن کے مرکز اور حاشیے کی بات کی۔ مارکس نے کہا کہ سماج طبقاتی ہوتا ہے۔ کیا ان دونوں کے بیچ بھی کوئی رشتہ ممکن ہے؟
> (ج) لیوتار نے علم کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے کیا وہ کسی مارکسی تناظر سے خالی ہے؟
> (د) استعمار کے خلاف اولین آواز لینن کی ہے۔ کیا موجودہ پس نو آبادیاتی / ردنو آبادیاتی فکر کے درمیان تعلق ہے یا نہیں۔"(۳)

یہ فکر انگیز سوالات ترقی پسندی اور مابعد جدیدیت میں فکری ربط تلاشنے کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر قاضی عابد حقیقی مارکسسٹ تھے، انہیں نومارکسسٹ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اس لیے انہوں نے مارکسزم کے ساتھ ساتھ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ان چشموں سے بھی سیرابی کی ہے۔ جن سے دیگر ترقی پسندوں نے اجتناب برتا تھا۔ ان علمی گوشوں کو اپنے اوپر حرام قرار نہیں دیا۔ بلکہ فکری ربط تلاش کے ان نظریات کو ایک دوسرے کے پس منظر میں سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر قاضی عابد عملی نقاد ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھنے کے بعد معلوم پڑتا ہے کہ وہ کسی بھی نظریہ سازی کے خبط میں ہرگز مبتلا نہیں ہیں۔ ان کا مضمون "اردو تنقید کے جدید رجحانات" ملاحظہ کریں تو اس میں کسی رجحان ساز اضافے کی بجائے محض روایت کے جائزے پر اکتفا کرتے نظر آتے ہیں۔ اردو تنقید میں جدید رویے کے اظہار کا پہلا منظر اسلوبیات کو قرار دیتے ہیں جو لسانی فلسفے سے شغف اور اس کے عمیق مطالعے سے سامنے

آتا ہے۔ پاکستان میں اسلوبیاتی مطالعے کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہندوستان میں یہ روایت مسعود حسین خان ایسے ماہر لسانیات سے شروع ہوتی ہے۔ مغنی تبسم اور مرزا خلیل بیگ نے اس روایت کو بڑھاوا دیا ہے۔ منہاج تک پہنچانے میں گوپی چند نارنگ کا کام اہمیت کا حامل ہے۔ ساختیات سے دلچسپی جدید لسانی فلسفے سے جڑت کا پیش خیمہ ہے۔ بشریات کے پس منظر سے دو رجحانات روسی ہیئت پسندی اور ساختیات ابھرتے ہیں۔ ساختیاتی پڑھت مصنف اور تصنیف کے درمیان کسی بھی قسم کے ربط کی بجائے زبان کے نظام کی ثقافتی سطح پر تفہیم ممکن بناتا ہے۔ اردو میں اس موضوع پر پہلا مضمون لنڈا ونٹک کا قرار دیتے ہیں جو اگست ۱۹۷۸ء کو فنون کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے مضامین ہیں جو اس رجحان کی مخالفت میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر پہلے نقاد ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ساختیات کو اردو میں متعارف کرایا ہے۔ ہندوستان میں گوپی چند نارنگ اور پاکستان میں وزیر آغا نے ساختیات کو باقاعدہ موضوع بنایا ہے۔ ساختیات کے بعد اردو تنقید میں ایک بڑا رجحان پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کا سامنے آتا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے اس رجحان کو اہل اردو کے لیے عام فہم بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مابعد جدیدیت ایک وسیع مفہوم کی حامل اصطلاح ہے، جو علم و فلسفے کے کئی سرچشموں سے سیراب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد کا خیال ہے کہ وزیر آغا نے بھی امتزاجی تنقید کی اصطلاح اسی رجحان سے عکس کی ہو گی۔(۴) رد تشکیل تانیثی حسیت اور مابعد نو آبادیاتی رویہ مابعد جدیدیت کی دین ہے۔ اردو میں مابعد نو آبادیاتی تنقیدی رویے کے اولین آثار حسن عسکری کے ہاں پاتے ہیں۔ امتزاجی تنقید کے بانی ہونے کا سہرا وزیر آغا کے سر سجانے کے بجائے ان سے بھی پہلے اس رویے کے اولین نقوش ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ممتاز حسین اور ڈاکٹر اے بی اشرف کے ہاں تلاشے ہیں۔ "آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اُڑنا" کا سا رویہ اہل اردو میں ہمیشہ سے دیکھا اور پایا جاتا ہے۔ نئے نظریات کو اہل اردو نے ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھا ہے۔ انہیں قبولنے میں احتراز کا رویہ روا رکھا ہے جس سے اردو تنقید تشنہ کام رہی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر قاضی عابد لکھتے ہیں:

> "مابعد جدیدیت ایک تکثیری تنقیدی رویہ ہے۔ اس میں نفسیاتی تنقید اور ترقی پسند تنقید کا بے حد اہم کردار رہا ہے لیکن اصغر علی انجینئر اور ڈاکٹر محمد حسن کے علاوہ اردو کا کوئی بھی مارکسی نقاد مابعد جدیدیت کے ان حصوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکا جو التھیوسے اور ٹیری ایگلٹن کے تنقیدی افکار کی صورت میں اس کا جدید ورثہ تھے۔ اس طرح سے اردو کی نفسیاتی تنقید بھی لاکاں وغیرہ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکی۔"(۵)

مابعد جدید تنقیدی رجحانات پر اردو میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور وزیر آغا نے لکھا۔ کئی رسائل نے بھی اس میں اپنا حصہ ڈالا، مگر اس سب کے باوجود یہ مابعد جدید فکر اور رجحانات اردو تنقید کا روشن اور بصیرت

افروز باب بننے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ اس کے پیچھے کیا وجوہات رہیں؟ ایک سے زیادہ ان وجوہات کو ڈاکٹر قاضی عابد نے اپنے مضمون "جدید اردو تنقید اور جدید مغربی تنقید (چند معروضات)" میں وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان جدید (مابعد جدید) تنقیدی رویوں کی اساس جدید لسانیات پر بنیاد رکھتی ہے۔ جسے ساختیاتی لسانیات کا نام دیا جاتا ہے جس کے بنیاد گزار سوئس ماہر لسانیات سوسیور تھے۔ دوسری طرف اردو لسانیات میں ایسی کوئی روایت سرے سے موجود ہی نہیں رہی۔ اردو ماہرین لسانیات اردو زبان کے آغاز و ابتداء کے نظریات میں الجھے ہی نظر آتے ہیں۔ پھر لسانیات کے جدید رجحانات جب اردو میں آتے ہیں تو یہاں ان رویوں کے لیے زمین ہموار نہیں ملتی تو یہ اپنی جڑیں گہری نہیں کر پاتے۔

مابعد جدید مفکرین اور ماہر لسانیات کا عمیق نظری سے مطالعہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ یہ لوگ فلاسفہ تھے۔ ہمارے ہاں تو فلسفہ شجر ممنوعہ ہے۔ دنیا میں سکول کی سطح تک فلسفہ پڑھائے جانے کی کوشش کی جارہی ہے مگر ہمارے اردو ناقدین اور مفکرین کا فلسفے سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد کے نزدیک اردو میں مابعد جدید رویوں کی جگہ نہ بنا سکنے کے پیچھے ایک ہمارا سبب فلسفہ گریز رویہ بھی ہے۔

مابعد جدید تنقید مصنف سے اپنا رشتہ توڑ کر متن پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کرتی ہے۔ یہاں تک کہ مصنف کی موت کا اعلان بھی سنائی دینے لگتا ہے۔ اس سے تخلیق کار اور نقاد کے درمیان رقابت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ تخلیق کار بھی بذات خود تنقید سے استفادہ کرتا تھا، مگر اس کے بعد ایک طویل حد فاصل حائل ہوئی جو ان رجحانات کے پنپنے میں روکاٹ بنتی ہے۔ تخلیق کاروں نے اپنی ذات کی نفی کو برداشت نہ کیا اور مابعد جدیدیت میں ٹھن گئے۔ مابعد جدید رویوں کا اردو تنقید میں جگہ نہ بنا سکنے کا ایک اور سبب اصطلاحات کا غیر مانوس پن بھی ہے۔ مابعد جدید ناقدین کا کسی ایک اصطلاح پر اتفاق ممکن نہیں ہو پایا۔ دریدا کی معروف اصطلاح Deconstruction کا اردو ترجمہ ہر ناقد نے اپنی دانست کے مطابق ایک دوسرے سے مختلف کیا ہے۔ مظفر علی سید تشکیل نو، ڈاکٹر وزیر آغا نے ساخت شکنی، شمس الرحمن فاروقی اور نظیر صدیقی اسے لا تشکیل کا نام دیتے ہیں، جب کہ گوپی چند نارنگ اور عتیق اللہ اس کا ترجمہ رد تشکیل اور شارب ردولوی رد تعمیر کے نام سے کرتے ہیں(۶) اس اصطلاح کے بیشتر تراجم اس کی اصل روح سے کوسوں دور ہیں۔ قارئین اور ناقدین کو یہ اصطلاحیں خاصا پریشان کرتی ہیں۔ مابعد جدیدیت ایک صورت حال ہے، جو بدلتی رہتی ہے۔ یہ کسی ٹھوس اور سکہ بند فکر کو پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مابعد جدیدیت علم کے کثیر ذرائع پر اعتبار کرتی ہے اور اس بات پر زور دیتی ہے کہ صداقت کی ایک نہیں لاتعداد صورتیں ہیں(۷) ان سے پہلے کے رجحانات اور تحریکوں کا معاشرے کے ساتھ بامعنی رشتہ تھا۔ مابعد جدیدیت میں کسی بھی طرح کی معنویت کی تلاش لاحاصل عمل جانا گیا اور روایتی قارئین و ناقدین فکری طور پر اسے قبول کرنے سے گریزاں رہے۔

اردو کے بیشتر ناقدین کے نظریات مبہم اور گنجلک ہیں جس کا سبب ان کا بلاواسطہ اور بالاستعیاب مطالعہ کا فقدان قرار دیتے ہیں۔ دو تین اہم ناقدین کو چھوڑ کر زیادہ تر نے انگریزی زبان میں ترتیب دیئے گئے ریڈرز یا پھر گوپی چند نارنگ اور وزیر آغا کی کتب کا بنیادی ماخذ کے طور پر مطالعہ کیا ہے(۸) جس سے ان کی سمجھ کا سفر تیسری یا چوتھی سطح تک آتے آتے کہیں کا کہیں جا رُکا ہے۔ مطالعے اور تفہیم کی اس طور پر کمی کو نمائش علم سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے مضحک خیز صورت حال کا پیدا ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ مغرب میں تو جدید تنقیدی رویے سبک رفتاری سے پنپتے اور زوال آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آخری چند عشروں کو لیں تو ہماری جنریشن نے جس تیز رفتاری سے تغیر پذیری کا عمل جھیلا ہے ہم سے پہلے کی کسی بھی جنریشن نے اس قدر تیزی سے ٹیکنالوجی اور نظریات میں ارتقاء کا عمل نہیں دیکھا۔ ہم ایسے تیسری دنیا کے لوگ ایسی سبک رفتاری کا ساتھ دینے سے قاصر رہے ہیں۔ مغرب میں ایک تنقیدی رویہ پٹ کر بے دخل ہو چکتا ہے مگر ہم ابھی اس پر بات کا آغاز کرنے کا سوچ رہے ہوتے ہیں۔ اسلوبیات، ساختیات، مابعد ساختیات، رد تشکیل، مابعد نو آبادیات اور نیو مارکسزم ایسے رویے اور رجحانات جس تیزی سے پیدا اور ازکار رفتہ ہوئے جاتے ہیں ہم اردو والے ساتھ نہ دے سکنے کی بنیاد پر اردو میں ان کا چلن عام نہیں کر پائے۔ مغرب سے آنے والے یہ جدید تنقیدی رجحانات اور نظریات میں سے بعضے ایک دوسرے سے تضاد اور تخالف کے رشتے کے حامل ہیں۔ مثلاً ساختیات اور رد تشکیل، ساختیات اور مابعد جدیدیت مختلف النوع رویے ہیں مگر اردو کے ناقد ان سب کا ایک ہی سانس میں اس طور نام لیتے ہیں جیسے یہ ایک دوسرے کے مترادفات ہوں۔ اردو میں ان رویوں کا بار نہ پاسکنے کا ایک اہم سبب جس کی طرف ڈاکٹر قاضی عابد نے واضح اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے۔

> "ان تنقیدی رجحانات کی تشریح اور توضیح پر مبنی مضامین اور کتب تو کثرت سے سامنے آئیں لیکن عملی / اطلاقی تنقید کے نمونے بہت کم ہی سامنے آئے۔ دو چار مثالیں ملتی بھی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، لنڈا ونگ، ناصر عباس نیئر اور سید عامر سہیل کے مضامین، تو یہ قاری کے سامنے کوئی نیا دریچہ وا نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر نارنگ صاحب کا مضمون "فیض کو کیسے نہ پڑھیں" کسی نئی بصیرت افروز دنیا میں لے جانے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کی قرأت کے بعد کوئی ایسا نیا وژن سامنے نہیں آتا جو اس سے پہلے فیض پر لکھی گئی تنقید میں موجود نہ ہو۔ یہی حال دیگر اطلاقی نمونوں کا ہے۔"(۹)

اردو میں ان جدید تنقیدی نظریات کے شارحین کی زیادہ تر تعداد اپنے سے ماقبل رجحانات اور فکریات: ترقی پسندی اور جدیدیت کو ناپسند کرتی ہے۔ جس سے ہم خیالی کی بجائے حد فاصل میں اضافہ ہوا ہے۔ مغرب میں صورت حال اس سے بالکل برعکس دکھائی دیتی ہے۔ اردو میں ترقی پسندی اور جدیدیت سے مابعد فکر

کے حامل ناقدین نے ماقبل کو منظرنامے سے ہٹانے کی کوشش کی تو ماقبل نے مابعد نظری مباحث کے رد کی صورت میں مزاحمت کرنا شروع کر دی۔ محمد حسن عسکری جیسے جید ناقد مذہبی اور مابعد الطبیعات پر زد پڑنے کی وجہ سے ان رجحانات کو رد کیا۔ فضیل جعفری، وارث علوی اور احمد ہمیش ایسے ناقدین نے ان رویوں کا مضحکہ اڑاتے ہوئے جارحانہ اسلوب میں اسے سامراجی سازش کا شاخسانہ گردانا۔ کچھ ایسا ہی انداز ہمیں ڈاکٹر محمد عقیل، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی ایسے ترقی پسند ناقدین میں ملتا ہے۔ مابعد جدیدیت کو استعمار کی ایسی خواہش قرار دیتے ہیں جو اشرافیہ کا لسانی کھیل ہونے کی بنا پر انسانی ذہنوں پر قابض ہے اور نو آبادیاتی نظام کی نئی نئی شکلیں متعارف کرا رہا ہے۔ ایسے ناقدین کے نزدیک یہ فکر متمول لوگوں کی دولت میں اور غریبوں کی غربت میں بے پناہ اضافے کا فلسفہ ہے۔ اس سے امریکی استعمار کو طاقت کے ساتھ ساتھ امریکی دہشت گردی کو بھی ہوا مل رہی ہے۔(۱۰) اس جڑت کا ایک سبب یہ بھی بتایا گیا کہ یہ تصورات امریکہ کی یونیورسٹیوں سے شروع ہوئے ہیں، تو ان رویوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنا بنتا ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم پر حکومتی قبضے اور ریاسی تسلط کے سبب آزاد فکر اور روشن خیالی کا پنپنا ممکن نہیں رہا تو ہم امریکہ کے سرکاری تعلیمی اداروں سے پنپنے والی آزاد فکر پر کیسے شک نہ کرتے؟ ہمارے ہاں تو سرکاری نیم سرکاری یا حکومتی مراعات یافتہ ادارے ریاستی عزائم کی تکمیل میں مہروں کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس روایت کے پیش نظر اہل اردو بالخصوص بائیں بازو کے دھڑوں پر لازم ہے کہ اپنے ملکی سطح کے ایسے اداروں کے ساتھ ساتھ دیگر دنیاؤں کے آزاد اور خود مختیار اداروں کو بھی ایک ہی نظر سے دیکھیں۔ ہماری اعلیٰ دانش گاہیں تحقیقی مراکز بننے کی بجائے مذہب، عقیدہ، بنیاد پرستی، تشدد اور غلامانہ ذہنیت کی نمائندہ ہیں جن کی فکری آزادی اور خود مختاری سب سے ضروری ہے۔

یہ وہ اسباب و علل ہیں جو اردو میں جدید مغربی تنقیدی رویوں پر مبنی کوئی مستند بوطیقا تشکیل دینے میں رکاوٹ بنتے رہے ہیں اور آج تک یہ رکاوٹ موجود ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد نے نہایت استدلالی اور منطقی انداز میں نا صرف اس روک کو نشان زد کیا ہے بلکہ ان رویوں کی راہ ہموار بنانے کے لیے عملی طور پر قلم بھی اٹھایا ہے۔ انہوں نے ایسے فلسفیانہ مباحث کو اردو میں موضوع بحث لائے جن کا اس سے پہلے چلن نہ تھا۔ وہ ایسے مابعد جدید نقاد ہیں جو مصنف، تخلیق اور تنقید کی تثلیث کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ وہ مصنف کی موت کے داعی نہیں بنتے جس کا واضح ثبوت محمد علی صدیقی اور حالی کی تنقید نگاری کا محاکمہ ہے۔ دونوں مضامین کے حواشی میں مصنف سے متعلقہ سوانحی نوٹ بھی لازم طور پر شامل ہیں۔ انہوں نے مغربی ناقدین کے بالواسطہ مطالعے کی روایت کی نا صرف حوصلہ شکنی کی ہے بلکہ خود اور اپنے شاگردوں اور ہم فکر دوستوں کو بلاواسطہ مطالعے کی طرف راغب کرتے ہیں۔ اپنے سکالروں سے نئے تنقیدی رویوں کے انگریزی سے اردو میں تراجم کرا کے ان رجحانات کو سمجھنے کی راہ عملی طور پر ہموار کی ہے۔ انہوں نے ایسے موضوعات پر جب بھی قلم اٹھایا ہے، کسی بھی قسم کی نظریہ

سازی کی بجائے اطلاقی جہات کو سامنے لاتے ہیں۔ یونیورسٹی کی سطح پر اپنے طالب علموں کے لیے آزاد اور فکری مکالمہ کو رواج دینا ان کا خاصا رہا ہے۔

ہر دور کے مقتدر طبقات نے تاریخ کو اپنی منشا کے مطابق ڈھالا اور مسخ کیا ہے۔ تاریخ اس طور پر تشکیل دی گئی جس سے کسی خاص مقتدر گروہ یا صاحب اختیار لوگوں کے نقطہ نظر کو تقویت ملتی رہی ہے۔ نو تاریخیت تاریخ کو از سر نو پڑھتی ہے۔ تاریخ کی نئی پڑھت میں ادبی اور غیر ادبی متون کو برابر رکھا جاتا ہے۔ نو تاریخیت ادبی متون کی ادبیت کے پس منظر میں موجود تاریخ کو سامنے لاتی ہے۔ ایک عہد سے متعلق تخلیق پانے والے ادبی اور غیر ادبی متون کو ایک دوسرے کے متوازی لا کھڑا کرتی ہے۔(۱۱) ڈاکٹر قاضی عابد نے اپنے مضمون "قصص ہند: تاریخیت اور نو تاریخیت" میں محمد حسین آزاد کی تصنیف قصص ہند (جلد دوم) کو تاریخیت اور نو تاریخیت سے اس لیے جوڑ کر مطالعہ کیا ہے کیوں کہ یہ کتاب موضوع کے اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ ہے جو نو آبادیاتی عہد میں ایک درسی کتاب کے طور پر استعمار کے زیر سایہ تصنیفی و تالیفی۔ اس کتاب کا منفرد اسلوب اور اہم واقعات و اشخاص کا کہانی کی ہیئت میں بیان اسے ادب کے زمرے میں شامل کر دیتا ہے۔ تاریخ حصہ بننے والے واقعات اور اشخاص گذشتہ عہد سے جڑے ہوئے ہیں۔ مابعد جدیدیت کا نظریہ کہ متن کثیر الجہت اور کثیر المعنی ہوتا ہے۔ تعبیر کے لامتناہی سلسلے کو تقویت دیتا ہے۔ تعبیر کے اس نہ رکنے والے عمل میں متن کے تناظر کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہتا۔

ڈاکٹر قاضی عابد تاریخ، تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث میں جہاں علمِ تاریخ کے ماہرین سے روشنی لیتے ہیں، وہیں مارکسی ادبی ناقدین خاص کر ثقافتی مادیت سے جڑے ریمنڈ ولیمز اور نو تاریخیت کو تنقیدی رجحان کے طور پر متعارف کرانے والے سٹیفن گرین بلاٹ سے استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ فوکو کی علم اور طاقت کے تال میل سے جنم لینے والی علمی روایت اس رجحان کو سب سے زیادہ تقویت دیتی ہے۔ متن کے مکرر تجزیے کی طرف لے کر جاتی ہے۔ محمد حسین آزاد کی اس تصنیف میں سے مصنف نے نو تاریخی تجزیے کے لیے چند سلاطین اور ان کے ادوار کا انتخاب کیا ہے۔ جن میں محمود غزنوی، اکبر اعظم، اورنگ زیب، شیواجی، محمد شاہ اور کچھ نسائی کردار نور جہاں، پدمنی، دیول دیو شامل ہیں۔ ڈاکٹر قاضی عابد نے مسلمانوں میں بادشاہوں، شہزادوں اور سپہ سالاروں کے اجاگر کیے گئے سورمائی روپ اور ہندو مورخین کے ہاں بادشاہوں، شہزادوں اور سپہ سالاروں کی رومانی تشکیل سے اساطیری صورت گری کو ہندوستان کی نو آبادیاتی تاریخ سے جوڑا ہے۔ انگریزوں نے ہندو مسلم تضاد کے سیاسی پہلو کو ثقافتی اور مذہبی روپ دینے کی کوشش کی، جس کے لیے لازم تھا کہ

دونوں مذاہب کے پیروکاروں کی ذہنی ساخت میں تفاوت کا پہلو پروان چڑھایا جائے۔(۱۲) جس کے نتیجے میں صدیوں سے رل مل بسنے والے ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو گئے۔ ایک کا قاتل دوسرے کا ہیرو ٹھہرتا ہے۔

پاکستانی سماج میں محمود غزنی اور اس قبیل کے دیگر لوگوں کو ہمارے ملی و قومی ہیرو بنا کر پیش کیا گیا۔ ہمارے مذہبی و مقدس سورما، بت شکن اور مساوات پسند مجاہد اسلام محمود غزنوی کا نقشہ مولانا محمد حسین آزاد نے جس طور پر کھینچا ہے اس سے ہماری قومی تاریخ کا خود ساختہ بت پاش پاش ہو کر زمین بوس ہو جاتا ہے۔ ہمارا ہیرو جو فاتح سومنات اور بت شکن ہے قرب مرگ کے عالم میں تمام درباریوں کو اکٹھے کیے ہوئے ہے۔ درباریوں اور لوٹے ہوئے نقد و جواہر کے ڈھیروں کو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرتا اور آب دیدہ ہوتا ہے۔ جب زر و مال سے لدے بھرے ہاتھی گھوڑے دیکھتا ہے تو سرد آہیں بھرتا ہوا زار زار رونے لگتا ہے۔ درباری زر و جواہر سے آس لگائے کھڑے ہیں مگر وہ کسی کو ایک پیسہ دان کرنے کا روادار نہیں ٹھہرتا اور مال و زر کے دنیا میں رہ جانے کے ملال میں روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے۔(۱۳) اس طرح محمد حسین آزاد کی تاریخ ریاستی تاریخی بیانیے کی رد تشکیل کرتی ہے۔ ہم اس تاریخ میں محمود غزنوی کو ایک مقدس اساطیری دیوتا کی بجائے ایک بادشاہ کے فطری لوبھ و لالچ والے روپ میں دیکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسا آدمی ہے جس میں بشری کمزوریاں ہیں وہ نہ فرشتہ ہے اور نہ انسان۔ ڈاکٹر قاضی عابد نے نہایت خوب صورتی سے نو تاریخی ڈس کورس کا اطلاق محمود غزنوی کے دور پر کیا ہے جس سے ایک متبادل تاریخی بیانیہ سامنے آتا ہے۔ اکبر اور اورنگ زیب دونوں مغل شہنشاہ ہو گزرے ہیں مگر دونوں مغل زادوں تاریخ کے بیانیوں میں ایک دوسرے کے درمیان تضاد کا رشتہ تھا۔ دونوں آپس میں کچھ نہ تھے۔ ان دونوں کے درمیان ایک نسبت مشترک نظر آتی ہے کہ دونوں فقط بادشاہ نظر آتے ہیں جو اپنی حکومت اور تخت و تاج بچانے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ باپ کو قید بھی کرایا جاسکتا ہے اور بھائیوں کا قتل بھی جائزہ ٹھہرتا ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد مولانا محمد حسین آزاد کی تاریخ قصص ہند کے اس حصے کو جس میں اکبر اور اورنگ زیب کا احوال ملتا ہے، کو نو تاریخی پڑھت سے گزارتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "قصص ہند کے بیانیے میں اکبر آزاد کا ہیرو ہے اور اورنگ اینٹی ہیرو ہے۔ ایک کی سورمائی خصوصیات کے ساتھ محبت، خلوص اور پیار کا رشتہ ہے جب کہ دوسرے کے ساتھ مخاصمت، اور دونوں تشکیلی بیانیوں کے پیچھے جو نظری رویہ کام کر رہا ہے۔ اس کی تعبیر کئی طرح کی جاسکتی ہے۔ اوپر لکھا جاچکا ہے کہ آزاد ایک بشر دوست منصف ہیں، وہ اثنا عشری ہیں، اکثر ان کے نزدیک مثالی انسان / بادشاہ ہیں۔ اورنگ زیب ان کے نزدیک اس سے مختلف آدمی ہے لیکن پاکستان کے نام نہاد قومی تاریخی بیانیوں میں صورت حال اس سے مختلف ہے۔ اکبر سیکولر ہے اور ناپسندیدہ کردار ہے جب کہ اورنگ زیب ٹوپیاں سی کر اور کتابت کلام الٰہی کر کے گزر بسر کرنے

والا برگزیدہ بادشاہ ہے۔ اگر کوئی مورخ والد اور بھائیوں سے ان کے حسن سلوک کی طرف اشارہ کرے تو ہمارے قومی کلاکار / تاریخ نویس اس مورخ کو فوراً سیکولر قرار دے دیں گے جو ہمارے قومی بیانیے میں لامذہب اور گمراہ کے مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ ان دونوں بیانیوں میں (اکبر اور اورنگ زیب) آزاد اس نظری تاریخ سازی کی تعدیل / انہدام کرتا دکھائی دیتا ہے۔"(۱۴)

قصص ہند سے معلوم پڑتا ہے کہ اکبر اپنی حکومت چلانے اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے دیگر مذاہب سے حسن سلوک کرتا اور سیکولر رویوں کا سہارا لیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اورنگ زیب اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لیے مذہبی لبادہ اوڑھے ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد ایک صاف گو نقاد ہیں۔ جو کسی مصلحت بینی کا شکار ہوئے بنا اور بلا خوف و خطر ریاستی بیانیوں پر سوال اٹھانے اور متبادل بیانیے لانے سے گریز پا نہیں ہوتے۔

شیواجی کو پریم چند اور دیگر ہندو ادیبوں نے رومانی تشکیل سے اساطیری کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ محمد حسین آزاد شیواجی کو کسی اساطیری کردار کی بجائے راجپوتانہ آن بان سے پیش کرتے ہیں۔ جو اساطیری کی بجائے ایک اہم تاریخی کردار کے طور پر سامنے آتا ہے جس میں وجاہت، مردانگی، بہادری کے ساتھ مذہب کو سیاسی استعارے کے طور پر برتنے اور اسے اپنے حق میں استعمال کرنے کا ہنر بھی ہے۔ محمد حسین آزاد نے ہمارے مورخوں سے الگ امیج پیش کیا جو ان کے پیش کردہ محمد شاہ کے تضحیک آمیز تاریخ کا متبادل بیانیہ ہے۔ اس تاریخ سے ڈاکٹر قاضی عابد نے ایک اہم پہلو تلاشا ہے۔ آزاد نے اردو میں پہلی دفعہ نور جہاں، پدمنی اور دیول دیوی ایسے نسائی کرداروں کو کسی رومانی تشکیل میں پیش کرنے کی بجائے انہیں ذہانت، بہادری، شجاعت اور بصیرت کے معروضی انداز میں کامیابی سے پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر قاضی عابد نے آزاد کی قصص ہند کا تاریخیت اور نو تاریخیت کے تناظر میں اس طور پر مطالعہ کیا ہے کہ علم اور طاقت کے تال میل سے لکھی گئی ریاستی تاریخ کے کئی ساختہ بیانیوں کا انہدام کرتے ہوئے قصص ہند کو متبادل بیانیے کے طور پر لا کھڑا کرتے ہیں۔

پوسٹ کولونیل ازم ایک ایسا ڈسکورس ہے جو امریکہ کے انگریزی ادب اور دیگر یورپین ملکوں سے ابھرا ہے۔ یہ ڈسکورس ایسی علمی و ادبی کاوش ہے جو قبل از نو آبادیات اور مابعد نو آبادیات کے علاقوں سے تعلق رکھنے والوں کے جذبات و احساسات اور تجربات کو سمجھنے، پرکھنے اور سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں کسی خطے کے نو آبادیات بننے سے پہلے اور بعد کے معاملات اور صورت حال کا جائزہ لیا جاتا ہے اور نو آبادیات کے اثرات کو واضح کیا جاتا ہے۔(۱۵) مابعد جدیدیت کا لونیل خطوں کے اذہان کی صورت حال کو سمجھنے کے لیے رد نو آبادیاتی مطالعہ سے کام لیتی ہے۔ محمد اقبال کی نظم "پرندے کی فریاد" جس کے ساتھ انہوں نے خود قوسین

چڑھا کے لکھا ہے: (بچوں کے لیے)۔ اس بنا پر اقبال کے سکہ بند ناقدین نے بھی اس نظم کو درخور اعتنانہ جانا اور نظر انداز کر دیا ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد نے اس نظم پر ایک فکر انگیز مقالہ "پرندے کی فریاد۔ ایک ردِ نو آبادیاتی پڑھت" کے نام سے تحریر کیا۔ جس میں فاضل نقاد نے اقبال کی اس نظم کو نئے پس منظر میں دیکھنے اور پرکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد اقبال کی اس نظم پر لگائے گئے انگریزی سے ترجمہ اور چربہ کے الزام کی بھی ولیم کوپر کی نظم کے مصرعے دے کر تردید کرتے ہیں۔ اقبال کے اشرافیہ ناقدین "بچوں کے لیے" کی قوسین چڑھائے گئے الفاظ کی بابت اس اہم نظم کو نظر انداز کر گئے۔ خاص توجہ کے قابل نہ جانا۔ ان اشرافیہ ناقدین نے اقبال کی اسطورہ سازی کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اقبال کو مقدس گائے کے طور پر پیش کیا گیا، جس پر حقائق لکھنا یا کہنا قابل گرفت ٹھہرا۔ ڈاکٹر قاضی عابد اس متعلق لکھتے ہیں:۔

> "دراصل ۱۹۴۷ء کے بعد تشکیل پذیر ہونے والی نئی مملکت کے اندر اقبال کے نام پر ایک فکری اسطورہ سازی کی ایسی کوشش کی گئی جس میں اقبال کے کلام کو نیم الوہی رنگ کی دھنک میں اس طرح مستور کیا گیا کہ ایک روشن فکر شاعر کہیں پس منظر میں چلا گیا اور ایک کڑا اور خالص شدت پسند مسلم طالبانی فکر کا حامل، مذہبی آئیڈیولوگ کا تراشیدہ مفکر سامنے آنا شروع ہو گیا۔۔۔ اقبال کے متن کی نئی ریاست کی اشرافیہ اور ضیا الحق کے بعد بے حد طاقتور ہو جانے والے شدت پسند مذہبی طبقات نے اس طور پر توضیح یا تشریح کی کہ اقبال اور مولانا مودودی ایک ہی سطح کے فکری سرمائے کے حامل افراد نظر آنے لگے اور جہاں پر اقبال کی فکر پر وہ اپنی مرضی کا غازہ نہ چڑھا سکے وہاں انہوں نے یا تو اس فکر کو مسترد کر دیا یا پھر یہ کہا کہ اقبال یہ باتیں کرنے کے مجاز نہ تھے۔"(۱۶)

اقبال کی روشن فکر کو پس پشت ڈال کر اسطورہ سازی کے خبط میں مبتلا ہو کر متن کو اسطورہ زدہ شخصیت کی روشنی میں پڑھنے کی کوشش میں شخصیت یا اسطورہ کو بچانے کے لیے متن کی بلی چڑھائی گئی۔ ڈاکٹر قاضی عابد اقبال کی اسطورہ کی گئی شخصیت کی رد تشکیل کرتے ہوئے اپنے تھیسس کی تجدید کے لیے تمام تر توجہ متن پر مرکوز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نظم صرف ایک پرندے کی کہانی سے نکل کر علامت کے طور پر سامنے آتی ہے، جو کہ نو آبادیاتی صورت حال کی باخوبی عکاسی کرتی ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد متن کو کھلا اور لا اطراف قرار دے کر اس کی توضیحی پڑھت کے لیے کسی ترتیب کی بجائے متن کو آخر، درمیان اور ابتداء میں کہیں سے بھی پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ متن میں موجود مکرِ شاعرانہ کو کھولنے کے لیے متن میں اس طور آگے پیچھے ہونے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس نظم کی ردِ نو آبادیاتی قرات کے لیے آخری سے پہلے شعر سے شروع کرتے ہیں۔

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

یہ سطریں اس نظم کے قرار دیئے جانے والے روایتی مفاہیم کی رد تشکیل کرتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی بے بسی کی صورت حال اور اس کا درد بھرا احساس اس نظم میں موجود ہے۔ پرندہ نفسیاتی، جذباتی اور ثقافتی سطح پر دباؤ کا شکار نظر آتا ہے۔ جسے قفس میں اب صدائیں بھی سنائی نہیں دیتیں۔ وہ خواہش کرتا ہے کہ اس کی رہائی اس کے بس میں ہوتی۔ پرندے تو حیاتیاتی سطح پر جیتے ہیں۔ پرندوں کے ہاں ایسی ثقافتی جذباتی اور نفسیاتی سطحوں کا پایا جانا ناممکنات میں سے ہے اور پرندے کی علامتی سطح کی پیش کش پر دال ہے۔ نو آبادیاتی نظام نو آباد زدہ کو ان تمام پہلوؤں (ثقافتی، جذباتی اور نفسیاتی) کے اعتبار سے متاثر کرتا ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد اس نظم کی فکری سطحوں کو مزید کھولتے ہیں۔

> "یہ نظم بیک وقت بہت ہی سادہ اور بے حد پیچیدہ ہے۔ اس میں مفلوف تجربے کا بیان اس کی پڑھت پر منحصر ہے۔ اگر آپ ایک بچے کی طرح سادہ انداز میں اسے پڑھتے ہیں تو پھر ایک ایسی بڑی عمر کے آدمی کے لیے کوئی مفہوم یا دلچسپی نہیں رکھتی جو اب بچہ نہیں رہا اور اگر آپ اس نظم کے مکر شاعرانہ کے پس پشت نو آبادیاتی تجربے کو چھو لیتے ہیں تو یہ نظم اپنے علامتی پیرائے میں اپنے مفہوم کی تہوں کو آپ پر کھولتی چلی جاتی ہے، اگر آپ اسے نو آبادیاتی تناظر میں کھولتے ہیں وہ آخری سطریں جن کی وجہ سے افتخار احمد صدیقی اس نظم کی رد نو آبادیاتی جہت سے انکار کرتے ہیں۔ ایک فنی ہنر میں ڈھلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یوں یہ نظم نو آبادیاتی زمانے کے فرد کے احساس غلامی کا تخلیقی تجربہ بن جاتی ہے اور یہی اس نظم کا حسن ہے۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آیا آپ اس نظم کو ایک بچہ بن کر پڑھتے ہیں یا پھر ایک باشعور قاری کی طرح مابعد نو آبادیاتی تناظر میں۔"(۱۷)

حالی کی شاعری اور تنقیدی فکریات میں جدت پسندی کے موجب ان پر پیروی مغربی کا ٹھپہ لگایا جاتا ہے۔ اس نئے پن کو نو آبادیات کے زیر اثر دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کلیم الدین احمد اور احسن فاروقی حالی سے ایسی توقعات لگا کر ان کی تنقید کو یکسر رد کرتے ہیں جو توقعات ان سے لگانا بنتی نہیں ہیں۔ ڈاکٹر قاضی عابد نے اپنے مقالہ "حالی اور مقدمہ شعر و شاعری: امتزاجیت کی اولین مثال، مابعد / رد نو آبادیاتی تناظر میں" ان تمام الزامات کے برعکس حالی کو دفاعی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ حالی اول الناقدین تھے مگر ان کے نکتہ چینوں سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ اسے خاتم الناقدین سمجھ بیٹھے۔ حالی پر الزام لگانے والوں کے نزدیک وہ انیسویں صدی کے نصف آخر کے مغربی ناقدین (کولرج ورڈز ورتھ اور ملٹن) سے واقف نہ تھے۔ ڈاکٹر قاضی عابد معترضین

حالی کے اعتراض کو پلٹتے ہیں اور معترضین کی اپنی فکریات پر سوال کھڑا کر دیتے ہیں۔ اگر حالی کی عدم واقفیت عیب ہے تو ان کے معترضین کی تنقید بھی تو بیسویں صدی کے نصف اول کے مغربی مفکرین / ناقدین کے مظاہرے سے خالی ہے۔(۱۸) جو ان کی وسیع المطالعاتی کے باوجود ان ناقدین کی فکر سے لاعلمی پر دال ہے۔ جیسا کہ مقالے کے عنوان سے عیاں ہے وہ حالی کو اردو کا پہلا امتزاجی نقاد قرار دیتے اور ان کی تنقید کو اردو کی سب سے پہلی امتزاجی تنقیدی دستاویز کا درجہ دیتے ہیں، جس سے وزیر آغا کے امتزاجی تنقید کی بنیادی گزاری ہونے کے دعویٰ کی رد تشکیل ہو جاتی ہے۔ حالی کے ہاں ادب کا کردار معاشرتی ہے۔ اس کے لیے لازم تھا کہ ان کے ہاں ادب کی وضع کاری، جمالیات اور بوطیقا کا ایک خاص تصور تنقیدی نظریات میں موجود ہو۔ حالی ان تینوں چیزوں سے سروکار رکھتے ہوئے شعر کی ماہیت، شکل و صورت اور شاعر کے نیچرل ہونے پر زور دیتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ مغربی فکر کا نقال ہونے کی بجائے امتزاجیت پسند فکر کے حامل نظر آتے ہیں۔ وہ مغربی سے زیادہ مشرقی شعریات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر قاضی عابد نے حالی کی فکر کو مشرقی دانش میں دریافت کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> "جوش کے حوالے سے حالی نے جو بحث اٹھائی ہے اس کا عربی اور عبرانی تناظر حالی کو ملٹن اور کالرج دونوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ اس پوری بحث میں حالی کا تنقیدی ذہن کارکردگی کے لحاظ سے نکتہ رسی کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ نہ کہ ملٹن اور کالرج کی رسمی نقالی (mimicry)، جوش (passionate) توضیحات میں حالی کے تنقیدی ذہن نے اپنی ثقافتی میراث (عربی اور عبرانی شاعری کی روایت) سے استفادہ کیا ہے۔ حالی کو کامل یقین ہے کہ حقیقت کا ادراک محسوسات سے ہی ممکن ہے اور کوئی بھی فرد اپنے احتساسی عمل سے ہی حقیقت دریافت کرتا یا کر سکتا ہے۔۔۔۔ ملٹن اور کالرج (ایک یورپی محقق) کے پردے میں حالی نے اپنے تصورات کی نمو کی ہے۔ یا پھر جہاں اسے ضرورت محسوس ہوئی ہے اس نے امتزاجی صورت حال سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ نو آبادکاروں کے تابع مہمل کہیں بھی نہیں بنے۔ انہیں اپنے ثقافتی اظہارات سے پوری طرح دستبردار ہونا پسند نہیں ہے۔"(۱۹)

حالی کی تنقید نگاری سے واضح ہے کہ ان کی انگریزی زبان سے عدم واقفیت کی بنیاد پر ان کا ورڈزورتھ، کالرج اور ملٹن وغیرہ کا مطالعہ نہ تھا۔ انہوں نے ان کے نام ضرور سن رکھے ہوں گے، شاید ان کی نیچرل شاعری کا چرچا بھی ان تک پہنچا ہو گا۔ اس بنا پر ناقدین نے حالی کو مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے۔ حالی کا جس ادبی شعری روایت سے لاشعوری جڑت ہے، ان مشرقی علوم شعر اور شعریات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد نے حالی کی فکری نہاد کا سراغ دانش شرق سے لگایا ہے۔ کیوں کہ حالی نے عربی و فارسی زبان و ادب کی

تعلیم حاصل کی تھی، حالی کا پسندیدہ شاعر اور نثر نگار مغرب سے نہیں بلکہ سعدی شیرازی ہے۔ حالی اردو شاعری میں شیفتہ سے متاثر ہیں۔ جس کی شاعری کی بوطیقا حقیقت پسندی، زمین سے جڑت اور پیکروں کی تجسیم کے زیادہ قریب ہے۔ حالی مشرقی شعری سرمائے میں موجود مبالغے سے نفور سے کام نہیں لیتے بلکہ احتراز برتتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایسے تناظرات ہیں جو لاشعوری طور پر حالی کی فکر و افتاد کا حصہ ہیں جن سے شعوری طور پر بھی جان چھڑانا ممکن نظر نہیں آتا۔ حالی کے ہاں نیچرل شاعری کا تصور محض مغربی مفکر کی دین قرار دینا زیادتی ہو گا، حالی فکری نہاد میں امتزاجیت پسند نقاد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ نیچرل سے مراد ان کے ہاں حقیقت پسندی ہے۔ نیچرل شاعری سے مراد ایسی شاعری بھی بالکل نہیں لیتے جس میں نیچریوں کے تصورات مذہب پیش کیے گئے ہوں۔(۲۰) تخیل میں وہ کالرج کے نقال کس طور پر ہو سکتے ہیں۔ ان کا تو کالرج کا مطالعہ ہی نہ تھا۔ اسی طرح مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ کے معاملے میں فکری طور پر انہیں عربی کا پیرو قرار دیا جا سکتا ہے۔ شعر کے تصور کے حوالے سے غور کیا جائے تو حالی کی روح بدیسی کی بجائے دیسی واد ہے۔ اس لیے حالی کی امتزاجیت نو آبادیات کا آلہ کار بننے کی بجائے نو آبادیات کے خلاف مزاحمت کا کام کرتی ہے۔ حالی کے معترضین پر کڑی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "اردو کے وہ ناقدین جو ردنو آبادیات تنقید کی ضابطہ بندی کی پیروی نہیں کرتے بلکہ کچھ عمومی کلیات کو مد نظر رکھ کر نو آبادیاتی زمانے کے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، اس امتزاجی عمل کو نقالی محض قرار دے کر خود اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ ان کی اپنی ذہنی کارکردگی میکالے کی اس تشکیل ذہنی کی پیروکار ہو گئی ہے۔ امتزاج / امتزاجیت کی پیچیدگی کو سمجھنے کی بجائے اسے ذہنی غلامی قرار دے کر اس کے رد عمل میں اس میکالین ذہنی تشکیل کے تناظر میں اپنے ادبی سرمائے کا جائزہ لیتے ہیں۔ (مثال: فتح محمد ملک کے ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد پر مضامین) گویا وہ خود ایک وضعی ذہنی غلامی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان ناقدین کے برعکس حالی اس امتزاج کو نو آبادکاروں کے مقابل انفعالیت کی بجائے مزاحمت بنا لیتا ہے، ادب اور معاشرت / معاشرے کے تعلق کے حوالے سے اٹھائے گئے مباحث میں حالی مشرق و مغرب کی مثالوں سے ہی امتزاج / پیوندکاری کا عمل بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ نہ تو احساس کمتری کا شکار ہیں اور نہ ہی بے جا تفاخر کا نہ ان دونوں کی جگہ وہ خود احتسابی کے عمل سے گزرنا پسند کرتے ہیں۔"(۲۱)

وہ حالی کی تنقیدی دستاویز کو مثالی تو قرار نہیں دیتے مگر نئی مثالی دستاویز کی تخلیق کا محرک ضرور سمجھتے ہیں۔ حالی کے ہاں ایسے لوگوں کے لیے سیکھنے کو بہت کچھ ہے جو اپنے ماضی اور اس سے جڑی ثقافتی و تہذیبی روایات کو از کار رفتہ نہیں سمجھتے۔ ڈاکٹر قاضی عابد کے نزدیک حالی تازہ واردان بساط نقد کو سیکھنے کے لیے بہت نہ بھی دیں تو بھی دو باتیں اہم ہیں جو تنقید کے عمل میں کلیدی درجہ رکھتی ہیں کہ ایک نقاد تنقید میں معروضیت کس

طور پر رکھ سکتا ہے دوسرا تنقید کی زبان کیسی ہوتی ہے۔(۲۲) یہ اردو میں تنقید کا پہلا امتزاجی کارنامہ ہے۔ حالی کے ناقدین کے لیے یاد رکھنے کی بات ہے کہ مقدمہ شعر و شاعری اردو تنقید کا درس اول ہے۔ اس ابتدا کے طور پر دیکھا جائے۔ ڈاکٹر قاضی عابد نے تنقید حالی کو درس اول کے طور پر ہی لیا ہے دیگر ناقدین کی طرح نقش آخر نہیں سمجھ بیٹھے۔

حوالہ جات و حواشی

ا۔ ڈاکٹر قاضی عابد کا پورا نام عبدالرحمن عابد ہے۔ رحیم یار خان کی تحصیل خان پور کے نواحی قصبہ ظاہر پیر سے ملحق گاؤں غوث پور میں قاضی دوست محمد کے ہاں ۱۲ فروری ۱۹۶۷ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز غوث پور کے سکول سے کیا۔ گورنمنٹ ہائی سکول چاچڑاں شریف سے ۱۹۸۴ء کو میٹرک پاس کیا۔ خواجہ فرید کالج رحیم یار خان سے ۱۹۸۶ء کو ایف اے اردو لٹریچر کے اختیاری مضمون کے ساتھ مکمل کیا۔ ۱۹۸۸ء میں گورنمنٹ ترقی تعلیم کالج خان پور کٹورہ سے بی اے ایڈوانس اردو کے اضافی مضمون کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ کالج آنے سے پہلے ہی مطالعے سے گہرا شغف تھا۔ کالج کے زمانہ میں کالج اور شہر کے کتب خانوں سے علمی تشنگی کو سیر کرنے کا سامان پیدا کرتے رہے۔ مزید تعلیم کے لیے انہوں نے ملتان کا رخ کیا جہاں پر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے ۱۹۹۱ء کو ایم اے اردو کیا۔ ۱۹۹۴ء میں گورنمنٹ کالج منکیرہ بھکر میں اردو کے لیکچرار تعینات ہوئے۔ ۱۹۹۵ء میں بطور لیکچرار اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے منسلک ہوئے۔ ۲۰۰۰ء میں اپنے ہی شعبہ سے "اردو افسانہ میں اساطیری عناصر" پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۲۰۱۱ء میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی سے پوسٹ ڈاکٹریٹ کیا۔ ۲۱ فروری ۲۰۲۲ء کو ان کی اچانک موت نے ان کے چاہنے والوں کو سوگوار کر دیا۔ انہوں نے ساٹھ سے زیادہ ایم فل اور بیس سے زیادہ پی ایچ ڈی کرائے۔ ان کی تصانیف میں پچاس کے قریب مقالات اور کتب شامل ہیں۔

i- اردو افسانہ اور اساطیر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء

ii- اساطیر، کتھا، کہانی اور مابعد جدید تناظر، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۱۶ء

iii- تحقیق، تنقید، تعبیر، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۱۶ء

iv- اردو کے نمائندہ کلاسیکل غزل گو، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۱ء

v- شعبہ اردو: تاریخ اور روایت، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۷ء

vi- تین ادبی اور فکری تحریکیں، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۱۱ء

vii- مقدمہ شعر و شاعری، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۱۴ء

viii- اردو ادب اور تانیثیت، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

ix- پہلی و ڈی سرائیکی لغت، سرائیکی ایریا سٹڈی سنٹر، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۱۶ء

x- تحقیق، مسائل تے حل، ادارہ تحقیقاتِ زبان و ادب، بہاول پور

xi- ارمغانِ روہینہ ترین، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۱۷ء

۲۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، اساطیر، کتھا، کہانی اور مابعد جدید تناظر (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۶ء)، ص ۹

۳۔ ایضاً، ص ۹، ۱۰

۴۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۵۔ ایضاً، ص ۱۶۰

۶۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۷۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت (فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۶۴

۸۔ اساطیر، کتھا، کہانی اور مابعد جدید تناظر، محولہ بالا، ص ۱۶۸

۹۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۱۰۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت: حقائق و تجزیہ (لاہور: پیس پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۲۱، ۲۲

۱۱۔ پیٹر بیری، بنیادی تنقیدی تصورات، مترجم الیاس بابر اعوان (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۱۸۹

۱۲۔ اساطیر، کتھا، کہانی اور مابعد جدید تناظر، محولہ بالا، ص ۱۹۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۹۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۹۸

۱۵۔ روف نیازی، مابعد جدیدیت: تاریخ و تنقید (کراچی: مطبوعات نیازیہ، سن ندارد)، ص ۳۶، ۳۷

۱۶۔ اساطیر، کتھا، کہانی اور مابعد جدید تناظر، محولہ بالا، ص ۲۲۰، ۲۲۱

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۲۸

۱۸۔ حالی اور مقدمہ شعر و شاعری: امتزاجیت کی اولین مثال، مابعد /ردنو آبادیاتی تناظر میں، مشمولہ: نو آبادیات و مابعد نو آبادیات (نظریہ، تاریخ، اطلاق)، مرتبہ محمد عامر سہیل (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ص ۴۸

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۰۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۹۱، ۴۹۲

۲۱۔ ایضاً، ص ۴۹۰، ۴۹۱